ہیں کہ طبیعی یا روحانی فیوض کی وجہ سے انسان چاہتا ہے وہیں رہ جائے لیکن ان سب سے گزر جانا پڑتا اور دل بہت سی حسرتوں سے بھر جاتا ہے یہ خلل کا پہلو نہ ہو تو کیا کہنے ہیں اس روانیٔ عمر کے جو سفر میں گزرے۔ اسی غزل کے دُوسرے شعر میں اندازہ و اعتدال کی نصیحت کرتا ہے کہ زندگی میں غرقِ حصولِ تمنّا ہونے سے بھی بچنا چاہیے۔ مثال بہت اچھی دی ہے کہ پیاسا پانی کا طالب ہوتا ہے۔ اگر پانی اتنا ہو کہ اسے غرق کر دے تو حیات کا طالب حدت کی پیٹ میں آ جائے گا

ع
بوصل لطف باندازۂ تحمل کن!
کہ مرگِ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد

'آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند' کا مصرع غالبؔ نے ایک ہی غزل میں دو جگہ باندھا ہے۔ پہلا شعر تو شراب نوشی کے متعلق ہے جیسے ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں۔ جس میں کہتا ہے یہ حکم کہ شراب ہر حالت میں ہر شخص کے لیے کلیتہً حرام ہے۔ ایک دروغ مصلحت آمیز ہے۔ اعتدال سے پینے والے اہلِ خرد کو تو انفرادی طور پر اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن قانون اکثریت کو مدِّنظر رکھ کر بنتا ہے اس لحاظ سے بے شک اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا میں عقلمند کم ہیں اور احمق زیادہ۔ قانون انسانوں کی عام حماقت مدّنظر رکھ کر بنایا جاتا ہے

ع
از مے تراہر آئنہ پرہیز گفتہ اند!
آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

اس غزل کے مقطع میں کہتا ہے اے غالبؔ دہر کے غیر مسلم تجھے

مُسلمان سمجھتے ہیں حالانکہ نہ تجھ میں کوئی مسلمانی کی بات ہے نہ تو اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتا ہے اور نہ مومن پارسا تجھ ایسے رِند شرابی کو مسلمانوں کے زمرے میں شمار کرے گا۔ تجھ سے شخص کو مسلمان کہنا بھی ایک دروغ مصلحت آمیز ہے۔ عمر بھر نماز نہ پڑھے اور روز شراب پیئے بھلا تو کہاں کا مسلمان ہے۔ ایک خط میں مرزا نے لکھا ہے، میں اپنے آپ پر تعجب کرتا ہوں کہ میری زندگی میں اسلام کی کوئی بات نہیں اس کے باوجود مسلمانوں کی ذلت اور تباہی سے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کا دل مسلمانوں کی عزت و ذلت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے وہ اسلام سے مطلقاً بیگانہ تو نہیں ہو سکتا۔ اقبال بھی اپنی نسبت کہتا ہے ع

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا!
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

اپنی مسلمانی کے متعلق غالبؔ کا یہ لطیفہ بھی لطف آفرین ہے جب غدر کے بعد انگریز فوجی مجسٹریٹ کے پوچھنے پر کہ وَل تم مسلمان ہو؟ غالبؔ نے یہ جواب دیا کہ حضور آدھا۔ مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ آدھا مسلمان کیسے ہوتا ہے۔ اس کی توضیح میں غالبؔ نے کہا کہ شراب پی لیتا ہوں مگر سوٗر نہیں کھاتا۔ مقطع میں غالبؔ کہتا ہے کہ اگر حقیقت دیکھو تو مجھ ایسے شخص کو مسلمان نہ کہنا چاہیے۔ لیکن ملت کی تقسیم کے لحاظ سے غیر مسلم مجھے مسلمان سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ جھوٹی بات ہے خواہ یہ کہنا کسی مصلحت ہی پر مبنی ہو ع

غالبؔ ترا بدیر مسلماں شمردہ اند	آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

SALEEM LIBRARY
1/S Sher ·owala Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

چہ خیزد از سخنے کز درونِ جاں نبود
بریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود
حکیم ساقی و مے تند و من زبد خوئی!
ز رطلِ بادہ بخشم آیم ار گراں نبود

پہلے شعر میں سخن کی حقیقت بیان کرتا ہے۔ نثر ہو یا نظم تقریر ہو یا تحریر یا وہ محض سطح بیان کی لہریں ہیں یا بات قلب کی گہرائیوں میں سے ابھرتی ہے۔ جب تک بات دل سے نہ نکلے وہ دوسروں کے دلوں میں اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ ؎

ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد

(دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے   پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے)
(اقبالؔ)

غالبؔ کہتا ہے کہ جو بات اندرونِ جاں سے نہیں نکلتی وہ بالکل بے نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ محض لب و دہن سے ہوا کی جنبش ہے جو کانوں کے پردوں کو سطحی طور پر مرتعش کرتی ہے۔ اقبالؔ نے اپنی ایک نظم میں تمام فنونِ لطیفہ کے متعلق یہ صحیح فتویٰ دیا ہے کہ حرف و صوت ہو یا رنگ و چنگ اگر اس میں دلاویزی اور دلنشینی ہے تو سمجھ لو کہ خونِ جگر سے اس کی نمود ہوئی ہے۔ سخن کا سرچشمہ حقیقت کا کوئی تاثر ہونا چاہیے۔ ایسی ہی شاعری کے متعلق ہم غالبؔ کی ایک اور غزل کا مقطع درج کر چکے ہیں۔ ؎

بینی ام از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالبؔ اگر دم سخن رہ بضمیر من بری

کہتا ہے اگر بیان میں خونِ جگر کی نمود نہیں تو بہتر ہے کہ ایسی زبان بُریدہ

وہ سطحی اور مصنوعی بات کرنے سے یہ بہتر ہے کہ انسان کچھ نہ کہے۔

دوسرے شعر میں دین اور دانش کا ایک لطیف نکتہ بیان کیا جاتا ہے صہبائے حیات کا ساقی خدائے حکیم ہے۔ اس کے فیضان سے سب کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ لیکن انسان اپنی حماقت کی وجہ سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ نعمت چاہتا ہے تو اتنی فراواں کہ اگر اس کی یہ خواہش پوری کر دی جائے تو وہ تباہ ہو جائے۔ ہر ایک کو تقدیر الٰہی سے اس کے ظرف کے مطابق کچھ نہ کچھ عطا ہوتا ہے۔ لیکن ہر شخص بگڑتا ہے کہ مجھے استحقاق سے کم ملا ہے کہتا ہے کہ اکثر نعمتیں تیز شراب کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک خاص مقدار سے زیادہ حلق سے نیچے اُترے تو دل و جگر کو مجروح اور ہوش و حواس کو معطل کر دے۔ یہ بدخوئی اور ناشکری ان لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جنھیں اپنے ظرف کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ جب تک رطلِ گراں نہ ملے تھوڑے پیمانے پر راضی نہیں ہوتے۔ اگر ساقیٔ دہر کو حکیم سمجھیں تو اس حماقت میں مبتلا نہ ہوں۔ ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

چہ ذوقِ رہروی آں را کہ خار خاری نیست
مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد!

ایسی راہوں پر چلنے سے کیا فائدہ جہاں قدم قدم پر کانٹے نہ بچھے ہوں۔ زندگی کا ارتقا اور سیرت کی تعمیر تو مزاحمتوں پر غلبہ پانے سے ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کے لیے زندگی آسان کر دی جائے جو کچھ وہ چاہے آسانی

سے میسّر ہو جائے۔ صراطِ حیات میں ہر جگہ پھولوں کا فرش ہو نہ اپنے نفس کے ساتھ پیکار کی ضرورت پیش آئے اور نہ اپنے ماحول اور دُوسرے انسانوں سے کوئی کشاکش ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ فطرت کا یہ کرم ایک شدید ستم کے مرادف ہوگا نہ عقل و شعور کی ترقی ہوگی اور نہ کردار میں استواری پیدا ہوگی غالبؔ کہتا ہے کہ اگر کوئی دین کا بھی ایسا راستہ بتائے جس میں نہ جہادِ اصغر ہو اور نہ جہادِ اکبر۔ من مانی مرادیں بے جد وجہد حاصل ہوتی جائیں تو سمجھ لو کہ یہ صحیح راستہ نہیں۔ دین کا راستہ صراطِ مستقیم ضرور ہے۔ لیکن اس میں قدم قدم پر ابتلا امتحان اور آزمائش ہے۔ عبادات کے کچھ ظواہر آسانی سے ادا کرنے کے بعد یہ سمجھنا کہ میرا ایمان استوار اور کردار بے لوث ہو گیا ہے۔ ایک شدید مغالطہ ہے بقولِ اقبالؔ ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اقبالؔ کا یہ مصرع "چو می خواہی حیات اندر خطر زی" غالبؔ کے اسی شعر کی شرح ہے۔ غالبؔ نے ایک اور غزل میں دو شعر کہے ہیں جنھیں یہاں درج کرنا مناسب ہوگا۔ ؎

با غازیاں ز شرحِ غمِ کارزارِ نفس
شمشیر را بہ رعشہ ز تن جوہر افگنم!
با دہر یاں ز شکوۂ بیدادِ اہلِ دیں
مہرے ز خویشتن بہ دلِ کافر افگنم!

کہتا ہے کہ اپنے نفس کی پیکار میں مَیں نے جو معرکہ آرائی کی ہے۔ اس کی شرح اگر میں ان غازیوں کے سامنے کروں جو محض کافروں کے خلاف شمشیر زنی

کرتے رہے ہیں تو وہ سن کر کانپ اٹھیں اور ان کی تلواروں میں ایسا رعشہ پڑے کہ ان کے جوہر گر جائیں۔ اور مجھا یسے آزاد منش مفکّر پر مدعیانِ دین نے جو ظلم کیے ہیں اگر میں ملحدوں کے سامنے وہ تمام مظالم بیان کروں تو انھیں بھی مجھ پر رحم آنے لگے۔ غالبؔ بے چارہ کس شمار میں ہے۔ بڑے بڑے ائمہ دین اور معلمین سے پیشہ وروں اور دنیا طلب ملاؤں نے ہمیشہ ایسا ہی ظلم روا رکھا ہے۔ یہ ان کی سنت قدیم ہے جس سے کوئی صاف گو اور صاف باطن مصلح نہ بچا اور نہ بچے گا۔ جس خارزار کا ذکر غالبؔ کرتا ہے وہ تن آسانوں کے راستے میں نہیں آتا۔ سب سے زیادہ اذیت نبیوں کو پہنچی ہے ؎

دریں چمن گلِ بے خار کس نہ چید آرے
چراغِ مصطفویؐ با شرارِ بولہبی ست

اسی غزل میں اپنی شراب خواری کا اعتذار پیش کرتا ہے۔ یہ اعتذار اس کے کلام میں جا بجا ملتا ہے ؎

بیادہ گر بودم میل، شاعرم نہ فقیہ
سخن چہ ننگ ز آلودہ دامنی وارد

اگر شراب کی طرف کچھ میلان رکھتا ہُوں تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ میں آخر شاعر ہوں فقیہ تو نہیں۔ سخنور کو تھوڑی سی معافی ملنی چاہیے۔ ایک اور جگہ کہہ گیا ہے ؎

نہ مفتیم نہ مدرّس نہ محتسب نہ فقیہ
مرا چہ کار کہ منعِ شراب خواری کنم

میدانِ محشر میں بھی اپنے بیان میں کہتا ہے کہ میں نے کوئی اور بڑے گناہ تو نہیں کیے سوا شراب خواری کے

SALEEM LIBRARY
I/S Sheranwala Gate,
Dine Subhan Khan Lahore.

؎
مگر مے کہ آتش بگورم از دست
بہ ہنگامہ پروازِ مورم از دست

اور اس گناہ کا ارتکاب اس لیے کرتا تھا کہ شعر کہنے کے لیے تھوڑی سی چیونٹی کی پرواز اس سے پیدا ہو جاتی تھی۔ اگر دو گھونٹ پی کر شعر اچھا نکل آئے جس سے ہزاروں سخن فہم لطف اٹھائیں تو اس گناہ کی کافی تلافی ہو جاتی ہے۔ سردی کے موسم میں ایک غزل کے مطلع میں کہتا ہے ؎

بے مے نہ کند در کفِ من خامہ روانی
سرد است ہوا آتشِ بے دود کجائی

جب اس آتشِ بے دود سے رگ و پے کو نہ گرماؤں تو ہاتھ شل ہو جاتے ہیں قلم نہیں چلتا اب بتاؤ کہ اگر نہ پیوں تو شعر کیونکر کہوں۔ یہ لت اکثر شاعروں کو رہی ہے۔ اور بعض اکابر حکما بھی اس سے نہ بچ سکے۔ بو علی سینا نے طب میں جالینوس کو پیچھے چھوڑ دیا اور الٰہیات میں بھی معقولات کے گل کھلائے لیکن حکیم ہونے کے باوجود شراب وہ بھی پیتا تھا۔ بہت سے افکارِ عالیہ اسی گرمی نے پیدا کیے ہوں گے۔ حافظ علیہ الرحمۃ کے متعلق قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس کی شراب ہر جگہ صہبائے حقیقت ہی ہے۔ یا کہیں کہیں افشردۂ انگور بھی ہے۔ خیام کے متعلق بھی قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اہلِ مغرب نے تو یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ شاعروں، مصوّروں اور دوسرے فن کاروں کو اس معاملے میں تھوڑی معافی دینی چاہیے۔ مجاز اور حقیقت دونوں کے شاعر ہمارے زمانے میں بھی ایسے گزرے ہیں جو ایک عرصے تک مے نوش رہے۔ اگرچہ زندگی کے آخر دور میں تائب ہو گئے۔ کردے و گزشتے، پر زیادہ گرفت نہ ہونی چاہیے۔

[library stamp, illegible]

؎
چو از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است (اقبال)

ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس کے لیے اس کا جواز نہیں ہو سکتا۔ عام سوسائٹی کے لیے اس کا جواز خطرۂ عظیم ہے۔ ادنیٰ نفوس تو اس سے دنیا ہی میں جہنم پیدا کر لیتے ہیں۔ اور یہ آتشِ بے دود نارِ دوزخ بن جاتی ہے۔

دریغا کہ کام و لب از کار ماند
سخنہائے ناگفتہ بسیار ماند
گدائیم نہاں خانۂ راکہ دے
دراز بستگیہا بدیوار ماند!

جس شخص کے دل و دماغ کے اندر نوادر آفرینی کی سوتیں موجود ہیں اور جس کے وجدان میں ہر روز اچھوتے افکار اور لطیف تاثرات کی آفرینش ہوتی ہے۔ ہزار باتیں کہ چکنے کے بعد بھی اس کے باطن کا چشمہ خشک نہیں ہوتا۔ اسے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ گفتہ کے مقابل میں ناگفتہ کی مقدار بہت زیادہ ہے آخر میں قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں اور یہ تاسف طبیعت پر طاری رہتا ہے کہ کہنے کی باتیں نو اور بہت تھیں لیکن افسوس ہے کہ اب کہہ نہیں سکتا۔ پہلے شعر میں اسی حسرت کا اظہار ہے۔ دوسرے شعر میں غالب نے اسی خیال کو دہرایا ہے۔ جو اس کے نظریۂ خیالات کا جزو لاینفک ہے۔ وہ زندگی کو ایک پُراسرار چیز سمجھتا ہے۔ ہزار قیاس آرائیوں کے بعد بھی حقیقت ہاتھ نہیں آتی۔ حکیم ہو یا نبی آخر میں عجزِ ادراک ہی کا اقرار کرتا ہے۔ نظر میں جتنی گہرائی پیدا ہوتی ہے حقیقت اتنی ہی پُراسرار ہوتی جاتی ہے۔ حکما، اولیا اور انبیا نہاں خانۂ ذات کے دروازے کھٹکھٹاتے رہتے ہیں۔ ایک دروازہ کھلے تو اس سے

آگے دوسرا دروازہ مقفل دکھائی دیتا ہے جس کے لیے پھر کلید کی تلاش ہوتی ہے۔ زندگی کا بطون باطن در باطن ہے۔ لیکن انسان کا وظیفۂ حیات یہی ہے کہ وہ ذات و صفات کے دروازے کھٹکھٹاتا رہے۔ غالب کہتا ہے۔ کہ زندگی کے اسرار کدے کے سامنے گدا کی طرح کھڑا ہوں۔ پکارتا ہوں کہ اندر سے کوئی دروازہ کھولے۔ لیکن دروازے ایسے بند ہیں گویا دیوار آہنیں ہیں مگر درہائے بستہ کو دیوار سمجھ کر مایوس ہو کر لوٹ جانا درست نہیں۔ جو کچھ ہاتھ نہیں آتا اسی کی طلب اور تلاش کا نام عشق ہے جو جوہر آدم ہے ؎

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت مے نشود آنم آرزوست (رومی)

غالب کے گفتہ و ناگفتہ سے عرفی کا قصہ یاد آگیا۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ اس کی بیاض گم یا تلف ہو گئی۔ جس کے اندر اس کے کلام کے بے شمار جواہر پارے تھے۔ احباب نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ سخنور کا یہ سرمایہ نوع انسان کا ورثہ تھا۔ ایک فرد کی دولت نہیں کہ نوع انسان کا خزانہ لٹ گیا۔ لیکن عرفی نے غمگساروں کو جواب دیا کہ گفتہ نمانند، الحمدللہ کہ ناگفتہ بجاست۔ اب جو عرفی کا کلام ملتا ہے وہ اسی ناگفتہ کا فیضان ہے۔ ؎

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج
دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

زندگی میں جو حوادث پیش آتے ہیں ان کا سبب نہ فطرت کی نادانی ہے اور نہ خلاق فطرت کی بے رحمی یا بے اعتنائی۔ زلزلے، طوفان، بیماریاں اور

انفرادی نقطۂ نظر سے طرح طرح کے نقصانات سب فطرت کے قوانین کے مطابق ظہور میں آتے ہیں۔ کسی دانا کے لیے انھیں کسی کی نادانی پر محمول کرنا خود ایک نادانی ہے۔ فطرت اپنے قوانین نہیں بدلتی کیونکہ انھیں قوانین سے نظام عالم قائم ہے ہر فرد کے نفع و نقصان اور لذت و الم کو مدنظر رکھ کر اس فطرت کا قیام نہیں ہو سکتا جس کے متعلق خود خدائے حکیم کا ارشاد ہے کہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ۔ حوادث دہر کو ناسازگار پا کر دہر یا فلک کو گالی دینا دین و دانش کے منافی ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دہر کو گالی مت دو کیونکہ دہر میں ہی ہوں۔ لا تسبوا الدھر فانی انا الدھر۔ غالب کہتا ہے کہ باد صرصر نے اپنے آئین پر عمل کرتے ہوئے لنگر توڑ دیا۔ اور دریا کے طوفان نے کشتی پاش پاش کر دی مرد حکیم کا یہ کام نہیں کہ وہ فطرت کے ان مظاہر کو نادانی پر محمول کر کے افسوس کرنا شروع کر دے یا شاکیٔ روزگار ہو جائے۔ فطرت کے ساتھ علمی اور عقلی توافق پیدا کر کے اس سے منافع حاصل کرنے چاہییں۔ ملحد کہتا ہے کہ فطرت میں بے رحمی اور بے نیازی ہے وہ انسانوں کا نفع و ضرر مدنظر رکھ کر عمل نہیں کرتی۔ لہٰذا اس کے اندر نہ حکمت ہے نہ رحمت۔ یہ کمال درجے کی کوتاہ اندیشی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ پابند آئین لامتناہی فطرت افراد کا ہنگامی مفاد پیش نظر رکھ کر عمل نہیں کرتی۔ اگر ہر جزو کی منفعت مدنظر رکھی جائے تو کوئی کلیات قائم نہ ہو سکیں جسے آئین کہتے ہیں اس کا مدار تو کلیات ہی پر ہے۔ ہم اس سے پہلے سحابی کی یہ رباعی درج کر چکے ہیں جس کا مضمون یہ ہے کہ عالم خدائے لامحدود کا مظہر ہے اس کے مظاہر کو ذاتی دشمنی یا دوستی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا جہالت ہے۔

ے

عالم بگردش لا الٰہ الا ہوست
غافل بگمان کہ دشمن است او یا دوست
دریا بوجودِ خویش موجے دارد !
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یہ خس ناکس کا پندار ہے۔ وہ ہر مظہر کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتا ہے کہ فطرت میرے ساتھ دشمنی برت رہی ہے یا دوستی کا اظہار کر رہی ہے۔ اسی مضمون کا غالب کا یہ شعر ہم پہلے درج کر چکے ہیں کہ کوئی دریا میں ڈوب گیا یا کسی نے اس کے کنارے پہنچ کر پیاس بجھائی۔ دریا نے کسی سے کوئی ذاتی معاملہ نہیں کیا کہ ارادے سے ایک کو راحت پہنچائی ہو اور دوسرے کو زحمت میں مبتلا کیا ہو۔ ے

غرقہ بموجہ تاب خورد　　　تشنہ ز دجلہ آب خورد
زحمت ہیچ یک نداد　　　راحتِ ہیچ یک نخواست

بشرع آویز و حق می جو کم از مجنوں نۂ بارے
دلش با محمل است اما زباں با ساربان دارد

شریعت اور حقیقت ایک دوسری سے وابستہ ہیں لیکن شریعت ذریعہ طریقہ اور وسیلہ ہے۔ مقصودِ اصل حقیقت ہے۔ جب سے آدم پر توحید کا راز منکشف ہوا دین کی حقیقت قائم ہو گئی۔ اگرچہ شریعتیں بدلتی رہیں۔ شریعتوں کا تفاوت اقوام و ازمنہ کے اختلاف سے لازم آتا ہے۔ ملتوں کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ملت کی اصلاح کے لیے مخصوص آئین موثر ہوتے ہیں۔ ایک زمانے کی شریعت کا بہت سا حصہ دوسرے زمانے میں مبدل یا منسوخ ہو جاتا

ہے۔ مقصودِ حیات ایک ہی ہے کہ انسان اس نصب العین حقیقت کا قرب حاصل کرے جو خلاق جمال و کمال ہے۔ نیکیوں کی طرف لپکے اور بدیوں سے گریز کرے۔ زیادہ سے زیادہ عدالت اور رحمت کو اپنا شیوہ بنالے۔ ہر شریعت اس حقیقت کے مقابلے میں ایک ثانوی چیز ہے۔ قانون انسان کے تزکیے اور ارتقا کے لیے بنایا جاتا ہے۔ قانون انسانیت کے ماتحت ہے اور انسانیت الوہیت کے زیرِ سایہ اس لیے کہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ لیکن ہر مذہب کی تاریخ میں یہ منظر نظر آتا ہے کہ قانون کے ظواہر اور اس کے فروع وسیلہ اور ذریعہ ہونے کے بجائے خود مقصود بن جاتے ہیں اور عبادات و معاملات کے ظواہر میں دیندار یا مدعیانِ دین ایسے الجھ جاتے ہیں کہ مقصودِ اصلی کے لیے توجہ کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا۔ الفاظ کی جنگ میں ہفتاد و دو ملت کی پیکار دین کی جگہ لے لیتی ہے دین کی یہ گت بنتے ہوئے دیکھ کر مقصودِ حقیقی پر نظر جمانے والے گوشہ گیر ہوتے ہوئے تزکیۂ باطن میں منہمک ہو جاتے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں۔ کوئی ملت شریعت کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتی لیکن کوئی شریعت مقصودِ حیات نہیں ہو سکتی۔ شریعت مقصودِ حقیقی کی طرف جانے والے راستوں میں رہنمائی کرتی ہے۔ راستے کے خطرات سے آگاہی بخشتی ہے۔ وسوسوں سے نجات دلاتی ہے۔ زندگی میں ایک ضبط و نظم قائم کرتی ہے۔ مگر یہ سب ذرائع میں مقصودِ آخری نہیں۔ اردو میں غالب کا کیسا بلیغ شعر ہے ے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں !!

مندرجۂ صدر فارسی شعر میں غالب نے حقیقت اور شریعت کا صحیح رابطہ ایک بلیغ مثال سے واضح کیا ہے۔ طالبِ حقیقت سے کہتا ہے کہ تو مجنوں سے

توکم نہیں۔ اس نے لیلیٰ مجاز میں دل اٹکا رکھا ہے۔ دل لیلیٰ کے خیال میں منہمک ہے۔ لیکن اونٹنی کے ساتھ دوڑتے ہوئے وہ ساربان سے باتیں کرتا جاتا ہے محمل نشین سے براہِ راست خطاب کی جرأت نہیں کرتا۔ لیکن اگر ساربان نہ ہو اور اپنا فرض ادا نہ کرے تو دشتِ امکان میں زندگی کی سواری رُک جائے۔ لہٰذا آئین اور شعائر لازم ہیں مگر مقصودِ اصلی وہ ہے جو محمل میں روپوش ہے۔ ساربان سے راہ و ربط نہ رکھے تو مجنوں محمل کی پیروی نہیں کر سکتا۔ شریعت اور مقصودِ شریعت جسے صوفیہ حقیقت یا معرفت کہتے ہیں ان کا باہمی تعلق اسی انداز کا ہے۔ مقصود اور وسیلے میں امتیاز باقی رہتا ہے۔ وسیلہ وسیلہ ہے اور مقصود مقصود۔ وسیلے کو مقصود سمجھنے والا ظاہر پرست اور حقیقت سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔

با من میاویز اے پدر فرزندِ آزر را نگر!!
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

اگرچہ غالبؔ اس شعر میں اپنے باپ کو مخاطب کرتا معلوم ہوتا ہے لیکن اصل وہ ایک قاعدہ کلیہ بیان کر رہا ہے۔ ہر ملت میں عوام کا یہ حال ہوتا ہے کہ ان کا دین تحقیقی نہیں بلکہ تقلیدی ہوتا ہے۔ اور یہ تقلید ماں باپ کی تقلید سے شروع ہوتی ہے۔ والدین کا جو عقیدہ ہوتا ہے وہ اولاد کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ ایک مسیحی کہتا ہے کہ میں از روئے تحقیق حضرت مسیحؑ کی الوہیت پر اعتقاد رکھتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین کا معتقد ہے۔ اگر برہمنوں کے گھر پیدا ہوتا تو وہ لازماً برہمن ہوتا اور اسی شد و مد سے برہمنیت کے عقیدے پر قائم ہوتا۔ ایک بڑی حکیمانہ حدیث ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا۔ انسان فقط اپنی انسانی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی مذہب لے کر

نہیں آتا۔ لیکن اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ محض اس فطرت کی بنا پر حقیقت کو تلاش کرنا اور آزادی سے اس کے مطابق زندگی بسر کرنا لاکھوں انسانوں میں سے ایک کو بمشکل نصیب ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے افکار اور روایات کے شکنجوں میں سے نکل جانا شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ انبیاءؑ اور مصلحین کرام کے برگزیدہ گروہ کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے آبا و اجداد کے دین سے منحرف ہوتے ہیں ان کا معاشرہ انھیں کافر اور ملحد کہتا ہے۔ جب وہ کسی صداقت کی تعلیم دیتا ہے تو اپنی قوم کی طرف سے یہی جواب ملتا ہے کہ ہم تو وہی بات مانیں گے جس پر ہمارے آبا و اجداد قائم تھے۔ قرآن کریم میں بار بار یہ بات دُہرائی گئی ہے کہ ان سے پوچھو اگر تمھارے بزرگ گمراہ اور جاہل تھے تو بھی تم کیا انھیں کی پیروی پر مُصر رہو گے؟ انبیاءؑ کرام میں سے کوئی ایسا نہیں۔ جس نے اپنے آبا کے دین سے انحراف نہ کیا ہو۔ علامہ اقبال تقلید کی مذمت میں کہتے ہیں کہ اگر تقلید اچھا شیوہ ہوتا تو پیغمبر بھی اجداد ہی کے راستے پر چلتے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے ایسا نہ کیا۔ عوام بندِ پاستان میں پابزنجیر اور روایاتِ قدیمہ میں پا بگل رہتے ہیں۔ مگر خواص کا یہ شیوہ نہیں

؎ چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے
زبندِ پاستان آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے!

غالبؔ حضرت ابراہیمؑ کی مثال پیش کرتا ہے کہ باپ مشرک بت پرست اور بیٹا اہلِ توحید کا امام۔ جب کوئی شخص آزادی سے سوچنے لگتا ہے یا خدا کی طرف سے اس پر کوئی حقیقت منکشف ہوتی ہے تو وہ گرد و پیش کے رسوم و روایات

سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اگر بیٹا اپنے افکار اور اعمال میں بالکل اپنے باپ کا مثنیٰ ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے زندگی پر آزادانہ نظر نہیں ڈالی۔ کوئی بڑا مصلح ایسا نہیں گزرا جس نے اپنے باپ کے دین اور اپنی ملت کے رسوم و رواج کے خلاف بغاوت نہ کی ہو۔ اپنی سوسائٹی سے ہر بات میں متفق نہ ہونا حریت کا ثبوت ہے

؎ ازاں کہ پیروئ خلق گمرہی آرد !
نمی رویم براہے کہ کارواں رفت است

دلم در کعبہ از تنگی گرفت، آوارہ خواہم !
کہ با من وسعتِ بت خانہائے ہند و چین گوید

یہاں کعبے سے مراد محدود اور جامد مذہبی عقائد اور افکار ہیں۔ جو شخص ایک خاص عقیدے کی ملت میں پیدا ہوتا ہے وہ بلاتنقید اس کا ہر پہلو درست سمجھتا ہے۔ جو ملتیں دوسرے عقائد رکھتی یا دوسرے شعائر پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ رفتہ رفتہ وہ اس مغالطے میں مبتلا ہوتا جاتا ہے کہ تمام خوبیاں اور تمام صداقتیں اس کی اپنی ہی ملت میں پائی جاتی ہیں۔ وسعت معلومات سے انسان کے قلب میں بھی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ ادیان و ملل کا مطالعہ وسیع پیمانے پر ہونا چاہیے۔ اس تقابلی مطالعے سے بہت سے حقائق پر روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان اور چین کی تہذیبیں بڑی قدیم ہیں۔ ان تہذیبوں نے بھی بڑے بڑے حکما اور صلحا پیدا کیے۔ دین و دانش اور علوم و فنون میں صاحبانِ کمال انسانیت کے لیے بصیرت افروز ہوئے۔ ان سب کا حال معلوم ہونا چاہیے۔ اگر قومیں مشرک اور دیوتاؤں کو پوجنے والی ہو گئیں تو اس کے اسباب و علل سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ عموماً

متعصب اور تنگ نظر شخص وہی ہوتا ہے جو کسی مذہب کے ایک فرقے میں پیدا ہوا اور اس نے انسانی زندگی کی گوناگونی پر نظر نہ ڈالی۔ غالبؔ کہتا ہے کہ میں ایسے عقیدے کی تنگی سے بہت بیزار ہوتا ہوں جو مجھے پا بزنجیر کر دے اور آزادی سے دوسری ملتوں اور ان کے شعائر کا مطالعہ نہ کرنے دے۔ دوسری ملتوں میں بہت سی باتیں ایسی ہوں گی جو ہماری روایات سے بہتر ہوں دیگر اقوام کی تاریخ اور ان کے شعائر کے مطالعے سے ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان متعصب نہیں رہتا۔ مختلف افکار اور شعائر کا مقابلہ و موازنہ کر سکتا ہے۔ فرقہ پرست مدعیانِ دین میں اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں جنھیں ازمنہ ماضیہ کا حال کچھ معلوم نہیں۔ اور اس وقت کی معاصر قوموں کے حالات سے بھی قطعاً بے بہرہ ہیں اس جدید زمانے میں اس کے ماخذ کیا ہیں الحاد کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اس وقت مغربی سائنس دان مادہ پرست محدود عقلیت کے پرستار کا الحاد وہ نہیں جو قریش مکہ کا الحاد تھا۔ اگر اس وقت کوئی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہے تو وہ تاریخ کے گہرے مطالعے اور دیگر اقوام کے حالات سے ناواقف رہ کر معقول افراد کو اپنی طرف راجع نہ کر سکے گا۔ غالبؔ رسوم و قیود کی زنجیریں توڑ کر دوسری ملتوں کے مطالعے کی ترغیب دیتا ہے۔ کہتا ہے میں ایک گروہ کے افکار کے زندان سے نکل کر آوارہ پھرنا چاہتا ہوں تاکہ نوعِ انسان کی زندگی کے تنوع سے لطف اٹھاؤں۔ اور وسیع پیمانے پر آزادی سے گرمِ تماشا ہو کر حکمت اور عبرت حاصل کروں

تو نالی از خلۂ خار ذنگری کہ سپہر — سرِ حسینؓ علیؓ بر سناں بگرداند
بروز شادی و اندوہ دل منہ کہ قضا — چو قرعہ بر نمط امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند ! — کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند

کیا بصیرت افروز نظریۂ حیات ہے ۔ غالب کہتا ہے کہ تو آئین حیات سے ناآشنا معلوم ہوتا ہے ۔ اس چند روزہ حیات مستعار کو ظاہری اور عارضی لذت و الم کے پیمانے سے ناپتا ہے ۔ تجھے کانٹا چبھتا ہے تو شکایت روزگار کا نالہ تیرے اندر سے نکلتا ہے ۔ اتنی سی اذیت پر آہ و بکا کرتا ہے ۔ کبھی دہر کو کبھی فلک کو سبّ و شتم کا ہدف بناتا ہے ۔ سارا قصور تیرے پیمانے کا ہے جس سے تو زندگی کے اقدار کا اندازہ کرتا ہے ۔ یہ زندگی نہ مسرت آفرینی کے لیے ہے اور نہ افزائش غم اس کا مقصود ہے یہ کائنات امتحان گاہ اور تربیت گاہِ ارواح ہے ۔ اس امتحان میں کسی کو لذت حاصل ہوتی یا اذیت پہنچتی ہے ۔ یہ ایک ثانوی چیز ہے ۔ فاسق اور نالائق یہاں بساطِ خلافت پر بٹھا دیے جاتے ہیں حسینؓ شہید کا سر کسی شقی کے نیزے پر نظر آتا ہے ۔ حضرت موسیٰؑ جیسے عظیم الشان ہادی کو انسانوں کی رہبری سے پہلے بھیڑوں بکریوں کی چوپانی سپرد ہوتی ہے ۔ اگر فقط لذت و الم کو کامیابی اور ناکامی سعادت اور شقاوت کا معیار تصور کیا جائے تو اکثر انبیا، صلحا اور مصلحین ناکام ہی شمار ہوں گے ۔ لذت و الم زندگی کے صحیح پیمانے نہیں ۔ انسانی زندگی سیرت سازی کا کارخانہ ہے اور سیرت جد و جہد اور مصائب سے مقابلہ کرنے کے بغیر تقویت حاصل نہیں کر سکتی ۔ ایک شخص اپنی روح کو شیطان کے ہاتھوں فروخت کر کے عارضی لذتیں اور عارضی اقتدار حاصل کر سکتا ہے ۔ لیکن بقول حضرت مسیحؑ اگر روح بیچ کر سارا جہان بھی حاصل کر لیا تو بھی یہ خسارے کا سودا ہے ۔ جوہر انسانیت کے مقابلے میں سارے جہان کی کچھ قیمت نہیں اگر روح کو ناپاک و مریض بنا کر جسم کو تنومند اور ظاہری لباس سے آراستہ کر لیا تو عالم حقیقت میں یہ شدید درجے کا خسران شمار ہوگا ۔ جو شخص لذت و الم کا خیال برطرف کر کے اپنی اور نوع انسان

کی اصلاح میں کوشاں رہے اس کا نقد اجر تو یہ ہے کہ اس شخص کی روح میں پاکیزگی و قوت ہوگی ۔ اور اس انداز کی باطنی طمانیت ہوگی جو محض لذت پرستوں کو حاصل نہیں ہو سکتی ۔ اس عالم میں سعادت لذت کے مرادف نہیں اور نہ اصل سعادت ہی اس کی ضامن ہے کہ کسی سعید روح کو اس عالم سفلی میں دولت مملکت یا قوت حاصل ہوگی ۔ دولت نالائقوں اور بدکاروں کے حوالے کر کے فطرت اس کا امتحان کرنا چاہتی ہے کہ کون علم و فضل اور تقوے کو اس ظاہری نمائش سے اعلیٰ یا ادنیٰ سمجھتا ہے ۔ کون اس جوہر انسانیت کو جسے بقول اقبال جبریلؑ امین کے پاس بھی گرو نہیں رکھتے اہرمن کے ہاتھ بیچ ڈالتا ہے ۔

تاجر شوق بداں رہ بتجارت نرود
کہ رہ انجامد و سرمایہ بغارت نبرد

غالب اکثر اشعار میں شوق اور عشق کو ہم معنی استعمال کرتا ہے ۔ عشق کے بلند ترین مدارج میں بھی وہ کہیں کہیں عشق کے بجائے شوق کا لفظ استعمال کرتا ہے ۔ "ناقۂ شوقم و جبریلؑ حدی خوان من است"

کسی بلند نصب العین پر زندگی بسر کرنے والے کو وہ تاجر شوق کہتا ہے ۔ قرآن کریم بھی روحانی زندگی کے حصول کے لیے تجارت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے ۔ کہ آؤ لوگو تمھیں ایسی تجارت بتائیں جس میں کوئی گھاٹا نہیں ۔ اور دنیا طلبی کا سودا کرنے والوں کی نسبت یہ فتویٰ دیتا ہے کہ "فما ربحت تجارتھم" ان کی تجارت سے انھیں کوئی حقیقی اور پائدار فائدہ نہ پہنچا ۔ انبیاء، اولیاء، مصلحین اصلی شائقین علم ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس نے دنیوی منافع پر نظر جمائی ہو یا مال اسباب جمع کیا ہو ۔ یا نام و ننگ کو مدِ نظر رکھا ہو ۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں — مانمی خواہیم ننگ و نام را
(حافظ)

غالب کے مندرجہ بالا شعر کی شرح میں حافظ علیہ الرحمۃ کا ایک اور شعر پیش کر سکتے ہیں جس کا مضمون یہ ہے۔ کہ اگر کسی شخص کو کسی چیز کی دُھن ہو اور وُہ بلند مقاصدِ حیات کے نشے سے سرشار ہو تو اُس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اسبابِ روزگار اس کے پاس نہ رہیں گے۔ جو کچھ ہوگا وہ مقصود کے حصول پر قربان کر دے گا۔ ساز و سامان اور حقیقی اقدارِ حیات کا حصول ایک جگہ جمع نہیں ہوتے اسی لیے رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ میں بے سروسامانی یا فقر پر فخر کرتا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ نہ نبی کسی کے مال کا وارث ہوتا ہے اور نہ کسی خلف کو اس سے کوئی ورثہ پہنچتا ہے۔ اسلام سے قبل حضرت عثمان غنیؓ کے پاس بے حساب مال تھا لیکن وہ سارا اللہ کے راستے میں قربان ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مال مویشی اور اثاث البیت تک رسولِ کریمؐ کی خدمت میں اسلام کی خاطر پیش کر دیا۔ اور جب رسولِ کریمؐ نے دریافت کیا کہ گھر میں کچھ چھوڑا بھی ہے یا نہیں تو جواب دیا کہ خُدا اور اس کا رسُولؐ ہمارے لیے کافی دولت ہے۔ جب دیکھو کہ قوم کی رہنمائی کے مدعی محلات بنا رہے ہیں، سامانِ تعیش جمع کر رہے اور سرمایہ اندوزی کر رہے ہیں تو یقین کر لو کہ یہ لوگ اصلاح کا کوئی کام نہ کر سکیں گے اور حکمران بننے کے باوجود رعیّت کے قلوب پر ان کی حکومت نہ ہو گی۔ کوئی شخص دل سے ان کی عزّت نہ کرے گا۔ غالب کہتا ہے کہ حیاتِ حقیقی کا عاشق اور خدا یعنی مصدر و مقصودِ حیات کی طرف سفر کرنے والا ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہ زندگی انجام کو پہنچنے لگی اور جس راہ کو اختیار کیا تھا اس کی منزل قریب آگئی۔ لیکن ابھی تک اس کے پاس سرمایہ موجود ہے۔ ابھی کچھ سامانِ حیات ایسا ہے جس کی قربانی سے اس نے دریغ کیا ہے۔ تاجرِ شوق یعنی عاشقِ الٰہی ایسے راستے پر تجارت کے لیے نکلتا ہی نہیں۔ مردِ راہ کے پاس بھلا کوئی سامان باقی

رہ سکتا ہے؟

اسبابِ روزگار بے سازورگرو
کہ مردِ راہ باز نماند است ہیچ شے

یقینِ عشق کن و از سرِ گماں برخیز
بہ آشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

یقین اور عشق کا تعلق بہت قریبی ہے۔ عشق کسی بھی قسم کا ہو وہ یقین ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ دولت کا عشق رکھنے والا اس یقین سے زندگی بسر کرتا اور جدوجہد کرتا ہے کہ دولت واقعی لذّت و اقتدار کا سرچشمہ ہے۔ علم سے محبت رکھنے والا علم کی قیمت کو قائم و دائم سمجھتا ہے۔ اعلیٰ ترین عشق سرچشمۂ جمال و کمال یعنی خدا کا عشق ہے۔ یہ عشق انبیاء میں بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ محبوب پر ان کا یقین کامل ہوتا ہے۔ جہاں یقین اور ایمان کی کمی ہو وہاں عشق کی بھی کمی ہوتی ہے۔ فرد ہو یا ملت۔ کسی نہ کسی عشق ہی سے زندہ رہتی ہے۔

انساں بمیرد از بے یقینی (اقبال)

عام لوگوں کے ایمان میں گمان کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اور استدلال سے حقائقِ ابدی پر پہنچنے والے حکما بھی گمان کے دائرے سے نہیں نکل سکتے ان کا استدلال اور عقلی یقین زیادہ تر گمانِ غالب کے درجے تک پہنچتا ہے اسی لیے ان کی رُوح میں وہ گرمی نہیں ہوتی۔ جو عشق اور یقین سے پیدا ہوتی ہے بعض اوقات غلط اندیش انسان کسی غلط چیز پر یقین کر لیتا ہے اور یہ غلط یقین بھی اسے ہر قسم کی کوشش اور ایثار کے لیے آمادہ کرتا ہے وہ زندہ تمنا جو قلب کو گرما دے اور رُوح کو تڑپا دے محض گمان سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم کہتا ہے

[redacted]M LIBRARY
1/3 [redacted]eranwala Gate,
Line Subhan K... Lahore.

کہ بعض لوگ اللہ کے متعلق محض ظن سے کام لیتے ہیں۔ لیکن محض ظن اللہ اور مقصودِ حیات کے معاملے میں انسان کے کام نہیں آتا۔ گمان سے قوتِ فکر متذبذب اور قوتِ عمل کمزور ہو جاتی ہے۔ غالب نے اس مطلع میں نہایت حکیمانہ بات کہی ہے اگر تو کسی بلند مقصود کے عشق کا متمنی ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے یقین پیدا کر کیونکہ عشق یقین سے بطورِ نتیجہ پیدا ہوگا۔ دوسرے مصرع میں ایک اور نکتہ بیان کیا ہے کہ جہاں یقین و عشق پیدا ہوگا وہاں سکون غائب ہو جائے گا۔ عشق میں جانگداز منزلیں طے کرنی پڑیں گی۔ نفس سے جہاد کرنا ہوگا۔ قدم قدم پر ابتلا اور امتحان ہوگا۔ زندگی کے دو ہی راستے ہیں یا سکون طلبی تن آسانی اور آشتی یا ہر قسم کے امتحان کے لیے تیار ہونا۔ اب تمہاری مرضی ہے خواہ اسے اختیار کر لو خواہ اُسے۔ ادنیٰ زندگی 'آشتی نشیں' کی طرف کھینچتی ہے جس میں نہ کوئی حوصلہ مندی ہے نہ جد و جہد اور اعلیٰ درجے کا عشق امتحان گاہ کی طرف لے جاتا ہے

؎ صلۂ شہید کیا ہے تب و تابِ جاودانہ (اقبال)

اقبال ہی نے حدودِ گمان سے نہ گزر سکنے والے حکیم کے متعلق کہا ہے

؎ بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور!
حکیم سوزِ محبت سے بے نصیب رہا

نیست باغنودنہا برگِ پر کشودن ہا
از عدم بروں آمد سعیِ آدم از من پرس

زندگی عدم سے وجود میں کس طرح آئی؟ اس کے متعلق حکما آج تک قیاس آرائی کر رہے ہیں۔ خلقتِ آدم کے متعلق ادیان میں بھی کچھ تمثیلی اشارے ملتے ہیں اور ان متشابہات و رموز کے متعلق شارحین ہم آہنگ نہیں۔ کوئی کہتا ہے

[redacted]
[redacted]

کہ ارواح کا وجود زماناً قالب سے مقدم تھا۔ کسی کا خیال ہے کہ روح قالب کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ عارفِ رومی رُوح کی ازلیت کے قائل ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رُوح کی تمنائیں قالب کو اپنے مطابق بطور آلۂ کار خلق کرتی ہیں۔ قالب از ماہست شد نے ما ازو۔ قرآن کہتا ہے کہ آدم کا قالب اسی زمین کی مٹّی سے بنا اور ایک خاص ترکیب اور تناسب کے ظہور میں آنے کے بعد خلاقِ کائنات نے اپنی رُوح اس کے اندر پھونکی۔ غالب کے اس شعر سے یہ عقیدہ ٹپکتا ہے کہ عدم میں بھی رُوحِ آدم موجود تھی۔ اور وجود پذیری کی خواہش و کوشش اسے عدم سے باہر لے آئی۔ اگر یہ سعی نہ ہوتی تو رُوحِ آدم عدم ہی میں خفتہ و غنودہ رہتی اور کبھی منصۂ شہود پر نہ آسکتی۔ غالب کہتا ہے کہ زندگی وجود پذیری کی خواہش اور تمنائے ارتقا ہے۔ یہی خواہش شوقِ پرواز کو پورا کرنے کیلئے پر و بال نکالتی ہے اگر خفتگی طاری رہتی تو سامانِ پرکشائی پیدا نہ ہوتا۔ اقبال کا یہ شعر بھی تقریباً اسی مضمون کا ہے۔

بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت
کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت

یہ نہیں کہ پہلے فطرت نے منقار پیدا کی جو نوا کے لیے موزوں ثابت ہوئی۔ بلکہ ذوقِ نوا نے منقار کا آلۂ صوت بنایا۔ چکور خاص قسم کی ٹانگوں کے باعث مستِ خرام نہیں ہوا۔ بلکہ شوخیٔ رفتار نے اس کے پاؤں کی تکوین کی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ تمنائے حیات ایک سعیٔ وجود پذیری اور شوقِ ظہور ہے۔ یہ تمنا نہ ہو تو بس عدم کی خفتگی ہے۔ جس میں نہ کوئی پرواز ہے اور نہ آفرینش پرو بازدہ وجود کی طرح عدم کی بھی متعدد سطحیں ہیں۔ آدم مسلسل عدم سے وجود میں آتا رہتا ہے۔ تکمیلِ آدم ابھی بہت دُور ہے۔ یہ تکمیل و فورِ شوق اور تمنائے

حیات کی فراوانی ہی سے ہو سکتی ہے۔ عدم میں لامتناہی ممکنات موجود ہیں۔ لیکن وجود پذیر ہونے سے قبل ان کی کیفیت عندون ہی کی رہتی ہے۔ وجود بالقوہ وجود بالفعل ہونے کا متمنّی ہے۔ عارف رومی کہتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ پیدا ہوا یا ہوتا ہے وہ حاجت ہی کی بدولت ہے۔ زندگی کو جو حاجت محسوس ہوتی ہے وہ اسے سعی سے پورا کرتی ہے۔ ساری بقا اور ارتقا اسی سے ہے

پس بیفزا حاجت اے محتاج زود'

آرائش زمانہ زبیداد کردہ اند!

ہر خوں کہ ریخت غازۂ روئے زمیں شناس

یہ عجیب و غریب مضمون ہے۔ کہتا ہے کہ زمانے کی آرائش ظلم سے ہوئی ہے۔ 'کردہ اند' کا فاعل یا قضا و قدر سمجھ لیجیے یا نوع انسان۔ روئے زمین پر جو آرائش و زیبائش ہوتی ہے وہ خون ریزی کی رنگینی ہے۔ عام خیال تو یہ ہے کہ ظلم سے تخریب ہوتی ہے اور رحم و عدل سے ترکیب و توازن حیات کا قیام ہے۔ سطحی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب الٹی بات کہہ رہا ہے لیکن ذرا نظر غائر سے دیکھیے تو حقیقت کا ایک پہلو سامنے آتا ہے کہ جمال حیات کی تہ میں بیداد ہے۔ جمال حیات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جمال جو خارجی فطرت میں دکھائی دیتا ہے۔ یا انسان کے علاوہ حیوانات اور نباتات میں دلکشی پیدا کرتا ہے دوسرا وہ جمال جو انسان نے تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ صناعی سے پیدا کیا ہے۔ دونوں طرح غالب کا یہ نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ڈارون نے جو نظریۂ حیات پیش کیا اس کا لب لباب تنازع للبقا یا پیکار حیات اور بقاء اصلح کا قانون ہے۔ ڈارون کہتا ہے کہ جانداروں

اور نباتات میں جو انواع اس وقت روئے زمین پر ہیں وہ ایسی انواع کو تباہ کر کے باقی رہی ہیں جو زندگی کے جہاد میں شکست کھا کر فنا ہو گئیں۔ بقاءِ اصلح کے قانون میں کوئی رحم کا عنصر نہیں فطرت کے دانت اور اس کے پنجے خون آلودہ ہیں۔ اس کے آئین میں کمزوری جرم ہے۔

گھڑیال اور مگرمچھ ہیں ان کو نگلے جاتے

دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں (حالی)

اس نظریۂ ارتقا کے مطابق جانداروں اور درختوں پھولوں اور پھلوں کی رنگینی و گوناگونی سب پیکار حیات کا نتیجہ ہے۔ قوت اور حسن اس پیکار میں دو ہتھیار ہیں۔ حسن کے ذریعے سے مطلوب کو اپنی طرف کھینچا جاتا ہے طاؤس کے پروں کی میناکاری جنسی کشش پیدا کرنے کا حیلہ ہے۔ کم رو اور قبیح حریف کو اس پیکار میں شکست ہو جائے گی اور شکست خوردہ رقیب پر کون رحم کرتا ہے۔ نظم ہستی میں ہر جگہ مصاف و جہاد ہی نظر آتا ہے۔ عرفی بھی کہتا ہے، اگر ساری ہستی کو غور سے دیکھو تو نظر آ جائے گا:۔

کہ ہر خارے دریں وادی ورفش کاویان مبنی'

ہر جگہ میدان جنگ میں علم بلند ہیں۔ اب عالم انسانی کو دیکھیے تمدن کے بڑے بڑے شاہکار ظلم کے بغیر ظہور میں نہ آ سکے۔ تمام عظیم الشان تہذیبوں کا مدار غلامی پر تھا۔ وہ ساری محنت و کاوش جو صنعت اور سامان تعیش پیدا کرتی تھی غلاموں کی محنت تھی۔ اس محنت کا اجر ان غلاموں کو بس اتنا ہی ملتا تھا۔ کہ سد رمق کے لیے نان جویں کے دو لقمے حلق سے نیچے اتار سکیں وہ نہ اپنی جان کے مالک تھے نہ مال کے اور نہ آبرو کے۔ زمینداری اور جاگیرداری کے دور میں محنت کش کسان کے خون اور پسینے سے مضبوط قلعے اور شاندار محلات بنتے

تھے ۔ مورخین اس پر متفق ہیں کہ تمام قدیم تہذیبوں اور تمدنوں کا جمال اور ان کی عظمت استحصال بالجبر سے پیدا ہوئی ۔ بابل کا تمدن ہو یا فراعنہ مصر کی عظمت یا روضۃ الکبریٰ کا جمال و کمال ان کے اسباب کا مورخانہ مطالعہ کیا جائے تو انسان اسی نتیجے پر پہنچتا ہے جو غالبؔ نے بیان کیا ہے کہ

آرائش زمانہ ز بیداد کردہ اند

اب بھی جن قوموں میں بڑی زمینداری، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا نظام قائم ہے وہاں ایک طرف نیم گرسنہ و نیم برہنہ مزدور اور کسان ہیں اور دوسری طرف کمال درجے کی پرخوری اور زیبائش تن ہے ۔ ہر طرح کی آسائش اور آرائش ہے ۔ فنون لطیفہ کی ساری پیداوار ان کے لیے ہے جو محنت کشوں سے خراج حاصل کر کے اپنے ذوق جمال کی پرورش کرتے ہیں ۔ ایک طرف انسان بھوک اور بیماری سے فنا ہوتے ہیں اور وہیں ان کے قریب ہیں بیدادگروں کے پاس زر و جواہر کے ڈھیر نظر آتے ہیں ۔ ابھی وہ تمدن ظہور میں نہیں آیا جہاں جمال بغیر ظلم کے پیدا ہو سکے ۔ جو تمدن اس کے مدعی ہیں وہاں بھی شدت کی بیداد موجود ہے ۔ غلامی اور ظلم دنیا سے ختم نہیں ہوا ۔ صرف اس کی صورتیں بدل گئی ہیں ابھی تک روئے حیات پر خون مظلوم کا غازہ ہے ۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بڑی بڑی انقلابی تحریکیں جنھوں نے زندگی کے اقدار کو ترقی دی ہے ۔ خون ریزی کے بغیر کامیاب نہ ہو سکیں ۔ اگر ان کی بدولت زندگی میں کچھ جمال پیدا ہوا ۔ تو وہ خون ریزی کے بغیر نہ ہو سکا ۔ غالبؔ نے اس شعر میں ساری فطرت عادے ارتقا اور ساری انسانی تاریخ کو چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے ؎

آرائش زمانہ ز بیداد کردہ اند!
ہر خوں کہ ریخت غازہ روئے زمیں شناس

علامہ اقبال فطرتِ خارجی اور دین دونوں میں ارتقا کے قائل تھے چنانچہ نورِ محمدی کی نسبت لکھتے ہیں ۔ ؎

شعلۂ عشقش صد ابراہیم سوخت
تا چراغِ یک محمدؐ برفروخت

تکیہ بر عالم و عابد نتواں کرد کہ ہست
آں یکے بیہدہ گو ایں دگرے بیہدہ کوش
نیست جز حرف در آں فرقۂ اندر زسرائے
نیست جز رنگ دریں طائفۂ ازرق پوش

کہتا ہے کہ نہ عالم پر بھروسا کرنا چاہیے اور نہ عابد پر اعتبار ۔ عالم ایک بیہودہ کوشش میں لگا ہوا ہے اور عابد بے سود ریاضت کر رہا ہے ہر عالم اور ہر عابد کے متعلق تو یہ کلیہ درست نہیں ہو سکتا ۔ یہاں عالم سے وہ عالم مراد ہے جس میں حقیقی ذوقِ تحقیق نہیں معرفت کی چاشنی نہیں فقط معلومات اور لغات کا خزانہ ہے ۔ علم ذریعہ ہونا چاہیے حکمت و معرفت کا ۔ مگر کثرت سے ایسے عالم ملتے ہیں جن کے علم سے نہ انھیں کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ نوع انسان کو ۔ خالی کچھ معلومات ہیں جن کی شیرازہ بندی حکمت نے نہیں کی ۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ خالی علم نہ خیر ہے اور نہ شر ۔ اس کے خیر یا شر ہونے کا مدار اس کی غایت اور استعمال پر ہے ۔ ؎

علم را بر تن زنی مارے شود
علم را بر جاں زنی یارے شود

یہی حال عبادت کا ہے ۔ عبادت رجوع الی اللہ اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ

SALEEM LIBRARY
1/3 Shah ... Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

اور وسیلہ ہے۔

غالب کہتا ہے کہ جہاں یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ وہاں ریاضت محض ورزش اعضا سے بھی کمتر درجے کی چیز ہے اسی لیے اسے بیہدہ کوشی کہتا ہے عالم کے اندر علم کا اور عابد کے اندر عبادت کا جوہر موجود ہو تو سبحان اللہ۔ لیکن ایسے صلحا بہت کم ہیں۔ عالموں کے گروہ کو فرقۂ اندرزسرا یعنی پیشہ ور ناصحوں کا گروہ کہتا ہے۔ یہاں عالم سے مراد وہ واعظ اور فقیہ ہے جس کا کام دوسروں کو نصیحت کرنا ہے۔ لیکن اس نصیحت پر خود عامل نہیں۔ اکثر علماء خواہ واعظ نہ بھی ہوں نہایت بلند باتیں کہتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے علم اور عمل کے درمیان ایک خلیج حائل ہوتی ہے۔ بعض عابدوں نے نمائش زہد کے لیے نیلے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ لیکن غالب کہتا ہے کہ اس ازرق پوشی میں رنگ ہی رنگ یعنی فریب ہی فریب ہے۔

ہمہ محسوس بود ایزد و عالم معقول!
غالب ایں زمزمہ آواز ندارد خاموش

یہ گہرا فلسفیانہ شعر ہے۔ عام حکما نے ادراکِ حقیقت کے مدارج قرار دیے ہیں۔ پہلا درجہ محسوسات کا ہے۔ پانچ حواس سے عالم نور و رنگ و بو اور اشیاء مادی کا ادراک ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس ادنیٰ شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں اضافیت بہت ہوتی ہے۔ ایک ہی شے مختلف حالتوں میں گرم یا سرد معلوم ہوتی ہے۔ ایک ہی شے دور سے چھوٹی اور نزدیک سے بڑی دکھائی دیتی ہے۔ خالی حواس سے حاصل کردہ علم بہت جزئی ہنگامی اور ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہی حواس حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس میں انسان کی کوئی امتیازی

SALEEM LIBRARY

خصوصیت نہیں۔ البتہ عقل انسان کا امتیازی جوہر ہے۔ جو حواس کے جزئیات سے گزر کر کلیات قائم کرتا اور مظاہر کی کثرت اور ان کے تغیرات میں ثابت و قائم قوانین تلاش کرتا ہے۔ اس سے اوپر ماورائے عقل ادراکات اور وجدانات ہیں۔ اور ایسی کیفیتیں ہیں جو معقولات اور کلیات سے الگ ہیں۔ انھیں محسوسات اور معقولات کی زبان میں بیان بھی نہیں کر سکتے۔ تمثیلات سے ان کی حقیقت دوسروں پر واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ادراک کی یہ تدریج مسلّمات میں شمار ہوتی ہے لیکن غالب نے اس عام روش سے ہٹ کر بات کی ہے وہ کہتا ہے کہ خدا محسوس ہے۔ اور عالم ایک نظامِ عقلی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کو محسوس کیونکر کر سکتے ہیں نہ اسے چھو سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں نہ اس کی آواز سن سکتے ہیں۔ غالب کے اس خیال کی توجیہ دو طرح ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ غالب وحدت وجود کا قائل ہونے کی وجہ سے ھو الظاھر و ھو الباطن کا معتقد ہے اگر خدا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو حواس ظاہری اور حواس باطنی سے اسے محسوس ہونا چاہیے۔ صفات ذات ہی کی مظہر ہیں مظاہر کا احساس بھی خدا ہی کی ذات کا احساس ہے۔ صوفیہ کا تجربہ ہے کہ الوہیت کا ادراک بھی براہِ راست ہوتا ہے اس میں عقل کی وساطت نہیں ہوتی۔ رویت الٰہی دانش کے بجائے بینش ہے اس لحاظ سے بھی خدا کو محسوس کر سکتے ہیں۔ عقلی ادراک ایک بالواسطہ ادراک ہے یہ ادراک اس انداز کا نہیں جیسے آنکھ کو نور کا اور کان کو آواز کا براہِ راست ادراک ہوتا ہے اب رہا عالم تو وہ معقول کس طرح ہے۔ قدیم فلسفے سے قطع نظر کرتے ہوئے جدید فلسفۂ مغرب کی طرف آئیے جو ایک لحاظ سے المانوی حکیم کانٹ کی تنقید سے شروع ہوتا ہے۔ کانٹ کا سارا فلسفہ یہی ہے کہ عالم معقول ہے۔ ہستیٔ مطلق فی نفسہا کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ لا ادریت برتتا ہے کہ اس کا علم

ممکن نہیں۔ نفس انسانی میں عقل کے کچھ سانچے ہیں۔ انھیں سانچوں میں ڈھل کر ہستیٔ مطلق جو مجہول ہے وہ معقول بن جاتی ہے۔ عقل کائنات میں جن قوانین کو تلاش کرتی ہے وہ خود اسی عقل کے آئینہ دار اور ایک طرح اس کی پیداوار ہیں۔ علت و معلول کا نظام اور ریاضیات سے عالم طبیعی کا ادراک سب عقلِ انسانی کا کاروبار ہے۔ اگر انسانی عقل ایسی نہ ہوتی تو عالم بھی ایسا نہ ہوتا۔ بات نہایت گہری ہے آسانی سے قابلِ فہم اور لائقِ یقین نہیں اس لیے غالب کہتا ہے کہ

'ایں زمزمہ آواز ندارد'

اس لیے خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ یہاں ایک صوفی کا قول بھی درج کرنے کے قابل ہے۔ جو کہتا ہے کہ خدا کا ہونا کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔ ساری دقت ماسوا کے سمجھنے میں ہے۔ جب کوئی صاحبِ حال کہتا ہے کہ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے تو بہرحال ایزد کو محسوس کر سکتے ہیں۔ عالم کو عقل کا آئینہ اور ایک لحاظ سے اس کی آفرینش کہنے والے صرف کانٹ جیسے فلسفی نہیں بلکہ اب ایڈنگٹن کی طرح کے سائنس دان فلاسفہ بھی یہی تعلیم پیش کر رہے ہیں کہ عالم کا ہمیں جو ادراک ہوتا ہے وہ عقل کی ساخت کی وجہ سے ہے۔ ہستی کا براہِ راست وجدان ممکن ہے اور اسے معقول کے بجائے محسوس کر سکتے ہیں۔ دونوں باتیں نہایت گہری ہیں۔ غالب چلتے چلتے ایک مقطع میں کہہ گیا ہے۔ لیکن اس کی تشریح کے لیے دفتر چاہئیں پھر بھی ضروری نہیں کہ یہ واضح ہو سکے۔ بہتر ہے کہ غالب کی نصیحت پر عمل کیا جائے اور سکوت اختیار کیا جائے۔

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقشِ پائے رہروان نامیدش

انسان کا خدا کی جانب سفر بہمہ قرب ایک لامتناہی سفر ہے۔ خدا اقرب بھی ہے اور ابعد بھی۔ انسانوں کو تخلقوا باخلاق اللہ کے مراحل طے کرنے کے لیے ابد درکار ہے۔ جسم اور مادے سے خدا تک ایک نردبان ہے۔ جس کی نہ ابتدا کا تصور ہو سکتا ہے نہ انتہا کا۔ والی ربک المنتہیٰ۔ بقولِ اقبال۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

اس سفرِ شوق اور سعیٔ ارتقا میں کوئی منزلِ آخری منزل نہیں۔ موت کے متعلق بھی میر تقی نے خوب کہا ہے 'یعنی آگے چلیں گے دم لے کر'۔ غالب کے اس شعر کی شرح دو طرح ہو سکتی ہے۔ ایک تو فرد کی روحانی ترقی کے منازل اور احوال میں کسی ایک حالت پر قائم ہو جانا ترقی کو روک دیتا ہے۔ روحانیت میں کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں انسان کہہ سکے کہ بس میں منزل پر پہنچ گیا آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں منزل رسی کا احساس ہو وہیں انسان کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہی کیفیت ہے۔ علم و فن اور اصلاحِ حال روز افزوں ترقی ہی سے زندہ و پائندہ ہیں۔ کہیں رک جانا جمود پیدا کرتا ہے اور ایک اچھی حالت بھی خراب ہونے لگتی ہے، 'رکہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں'۔ جتنے انبیاء گزرے ہیں وہ خدا ہی کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اس سفر کے دوران میں وہ کہیں کہیں ٹھہر کر معبد بھی بناتے گئے۔ شریعتیں بھی پیش کرتے گئے۔ کچھ عبادات کے طریقے بھی بتاتے رہے کچھ معاملات کی درستی کے آئین بناتے گئے۔ لیکن آدمؑ سے یہ قافلہ چلتا ہی گیا۔ بہت سی اُمتیں ظہور میں آئیں اور تقدیرِ معین کے مطابق ختم ہو گئیں۔ متعدد شریعتیں آئیں اور منسوخ ہو گئیں۔ عبادات کے طریقے پیدا ہوتے اور بدلتے گئے۔ کعبہ موحدِ اعظم حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی تاسیس کردہ یادگار ہے

SALEEM LIBRARY
I/S Sher nwala Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

اسی لیے غالب اسے نقشِ پائے رہرو کہتا ہے اور یہ نقشِ پا بھی ویسا ہی ہے۔ جس کے لیے مومن کہہ گیا ہے ؎

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

لیکن سنگ و خشت کا کعبہ سفر الی اللہ میں منزلِ مقصود نہیں ایک متبرک اور قابلِ احترام یادگار ہے۔ بقولِ غالب ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کعبہ خدا کی طرف جانے والے کی ایک منزل سرِ راہ ہے۔ اگر کوئی کعبے میں پہنچ کر سمجھے کہ میں خدا کے گھر تک پہنچ گیا تو یہ اس کی ناسمجھی ہوگی۔ خدا کسی مکان کا مکین نہیں۔ دنیا میں ہر گھر خدا ہی کا گھر ہے۔ سنگ و خشت کے کعبے کے مقابلے میں تو انسان کے دل ہی کی بدرجہا زیادہ قیمت ہے۔ ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہِ خلیلِ آزر است
دل گزرگاہِ جلیلِ اکبر است

خدا کی طرف سفر کرنے اور انسانوں کو اسی طرف لے جانے والے رہبر دنیا میں اپنے آثار چھوڑتے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی آخر منزلِ مقصود نہیں۔ راہِ سلوک کے تیز قدم راہرو صورت سے معنی کی طرف اور ظاہر سے باطن کی جانب سفر کرتے ہیں۔ اور ساری نوعِ انسان کدھر سے کدھر جا رہی ہے۔ اس کا تصوّر محال ہے۔

؎ کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
این قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید (حافظ)

ارتقا کوش برگزیدہ ہستیوں کے آثار حکمت آموز اور بصیرت افروز ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کا آئین یہی ہونا چاہیے کہ "در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم"۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ روحانی ترقی میں جلد آگے نہیں بڑھ سکتے۔ وہ پہلے پیشوایانِ دین کے آثار پر رک جاتے ہیں ان کے لیے مناسب بھی یہی ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے ؎

کعبہ را ویراں مکن اے عشق کایں جا یک نفس
گہ گہے پس ماندگانِ راہ منزل می کنند

لیکن جب کوئی ملت دیر تک ظواہر پر اٹک جائے تو اس کا روحانی تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ فیضی بھی غالب کی طرح کعبے سے مراد ظواہرِ دین لیتا ہے۔ اس کے زمانے میں علماءِ سوء نے دنیا طلبی اور خود غرضی کا محشر بپا کر رکھا تھا۔ ان کی شریعت کی ظاہری پابندی اور باطن کے کھوکھلا پن سے بیزار ہو کر کہتا ہے۔ ؎

بیا کہ روئے بہ محرابِ گاہِ نور نہیم
بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
حطیمِ کعبہ شکست و بنائے قبلہ بریخت
بیا کہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم

(میں نے یہ اشعار علامہ اقبال کو سنائے تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد فرمانے لگے کہ وہ اشعار میرے اندر گونج رہے ہیں۔ شاید میرے اندر سے بھی کچھ نکلوائیں گے)

؎ شادم کہ بر انکارِ من شیخ و برہمن گشتہ جمع
کز اختلافِ کفر و دیں خود خاطرِ من گشتہ جمع